مظفر مہدی ہاشمی

دیارِ دل کی رات میں چراغ سا جلا گیا

میں پانچ چھ برس کا بچہ تھا جبکہ ان کی بھرپور جوانی تھی۔ پورا فرنگی انڈیا ان سے مسحور تھا۔ ہمارے ہاں ان کی آمد و رفت بہت زیادہ تھی۔ ضلع مظفر گڑھ میں ان کے مرید لاکھوں کی تعداد میں تھے۔ میری پھوپھی نے بہت بعد میں مجھے بتلایا کہ ایک دن مشہور ہو گیا کہ امیر شریعت کو فرنگیوں کے کسی کارندے نے شہید کر دیا ہے۔ اس دن میرے والد صاحب، میاں خدا بخش ہاشمی شکار پر گئے ہوئے تھے۔ اور تو کچھ نہ سوجھی میں نے اپنے والد صاحب کی تلوار اپنے کندھے پر رکھی جو میرے قد سے بھی بڑی تھی اور گھر سے باہر نکل پڑا اور زبان سے اعلان کیا کہ جس کسی نے بھی میرے چچا کو شہید کیا ہے آج میں اسے قتل کر دوں گا میری پھوپھی نے ملازمین کو کہا کہ فوراً جاؤ اور اس سے تلوار چھین کر اور پکڑ کر گھر واپس لاؤ۔ میں ابھی گھر سے کچھ فاصلے تک ہی پہنچ پایا تھا کہ وہ لوگ پہنچ گئے اور مجھے زبردستی گھر لے آئے۔ میں سارا دن روتا رہا شام کو میرے والد صاحب گھر آئے انہیں جب حقیقت حال بیان کی گئی تو انہوں نے مجھے پیار کیا۔

پھر ایک روز مجھے بتایا گیا کہ میں نے تعلیم حاصل کرنے کے لئے اپنے گھر سے تقریباً پانچ چھے سو میل دور، جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی جانا ہے ان دنوں یہ ایک انوکھی بات تھی کیونکہ بڑے بڑے زمیندار اور پیسے والے لوگ بھی اپنے بچوں کو، صرف تعلیم کے لئے اتنی دور نہیں بھیجتے تھے۔ اور اگر بھیجتے بھی تھے تو میٹرک کے بعد۔ اور پھر جامعہ ملیہ اسلامہ تو فرنگی حکومت کے خلاف ایک ادارہ تھا۔ جہاں پنجاب کے بہت کم مسلمان زمیندار اپنے بچوں کو داخل کرانے کی جرات کرتے تھے۔ چنانچہ میں نے دیکھا کہ دور و نزدیک کے لوگ آ کر میرے والد صاحب کو اس کام سے منع کرنے کی کوشش کرنے لگے مگر انہیں تو شاہ جی کے حکم کی پاسداری تھی۔ جنہوں نے فرمایا تھا کہ بچوں کو انگریزی حکومت کے کسی بھی ادارے میں داخل کرانے کا نتیجہ انہیں غلامی میں پختہ کرنا تھا۔ اسی بنا پر تیسری جماعت تک کتابیں میں نے ایک پرائیوٹ استاد سے پڑھیں اور پھر چوتھی جماعت میں دہلی جا کر جامعہ ملیہ اسلامیہ میں داخلہ لے لیا۔ جہاں ابتدائی مدرسے کے استاد بھی ہائیڈ برگ، آکسفورڈ اور کولمبیا یونیورسٹیوں کے فارغ التحصیل تھے اور جامعہ میں پہلی جماعت سے دسویں جماعت تک کے لڑکوں کو پڑھاتے تھے۔ خود ڈاکٹر ذاکر حسین خان جو ان دنوں شیخ الجامعہ تھے اور آزادی کے بعد بھارت کے صدر منتخب ہوئے، ابتدائی مدرسے میں چھٹی جماعت کے بچوں کو انگریزی پڑھایا کرتے تھے۔

میرے جیسے اور بھی سینکڑوں ہزاروں بچوں اور ان کے والدین کو جامعہ ملیہ میں داخلے کی ترغیب دیتے۔ بعض لوگ بات مان لیتے اور بعض نہیں مانتے لیکن شاہ جی نے کبھی بھی جامعہ ملیہ میں جا کر وہاں کی انتظامیہ پر کوئی احسان نہ جتلایا کہ وہ ان کے لئے کچھ کر رہے ہیں۔ یہاں تک کہ بعض مخیر حضرات کو اس ادارے کے لئے

چندہ بھیجنے کو بھی کہتے۔ اور لطف کی بات یہ ہے کہ جامعہ والوں کو بعد میں پتہ چلتا کہ وہ رقم کس کی معرفت وہاں پہنچی تھی۔

سید عطاء اللہ شاہ بخاری، تمام جنوبی ایشیا میں واحد عالم دین تھے جنہوں نے اپنے نام کے ساتھ نہ کبھی

مولانا کا لقب پسند کیا اور نہ ہی علامہ کا، لوگوں نے انہیں از خود امیر شریعت کا لقب دیا جبکہ انہوں نے اس لقب کو بھی اپنے نام و نمود کا ذریعہ کبھی نہیں بنایا۔ تقریر ہو یا کسی محفل میں گفتگو وہ ہر مقام پر اپنے آپ کو یا تو صرف بخاری کہتے تھے۔ اور یا پھر عطاء اللہ شاہ۔ فرنگی حکومت ہو یا ہندو کانگریس، انہوں نے کبھی بھی ان کے کسی التفات کو در خور اعتنا نہیں سمجھا، یہاں تک کہ انہوں نے عوام سے بھی اپنے لئے نہ کبھی چندہ مانگا اور نہ ہی کسی وظیفے کے خواستگار ہوئے ان کی شیر جیسی سرخ آنکھیں اس دنیا میں کسی کی بھی ممنون نہیں ہوئیں۔ اور نہ ہی جھکیں، دین ہو یا دنیا، انہوں نے اپنی ہر بات پروردگار پر چھوڑ رکھی تھی اور یہ میرا ذاتی خیال ہے کہ اور تجربہ ہے کہ انہوں نے اپنے رب سے بھی کچھ مانگا تو اس کی رضا مانگی، تسلیم مانگی، اور قناعت مانگی، وگرنہ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ ایک دن ہمارے ہاں "قریشی مظفر گڑھ" میں تشریف فرما تھے، ان کے چند مرید بھی بیٹھے تھے کہ باتوں میں سے بات نکلی اور کہنے لگے کہ بعض اوقات میرے اوپر ایسی واردات بھی آتی ہیں کہ مجھے یقین ہو جاتا ہے کہ اگر میں کسی دیوار کو بھی کہوں تو وہ آگے کی طرف چلنے لگے۔

ان کی بے مثل خود داری نے انہیں قناعت عطاء کی اوزاسی قناعت کی بنا پر نہ وہ کسی کے احسان مند ہوئے اور نہ ہی ممنون یہاں تک کہ جب ان کی وفات کے بعد ان کا جنازہ پڑھا جا چکا تو مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ ہزاروں لوگوں نے شور مچا دیا کہ انہیں ملتان کے قلعہ کہنہ پر دفن کر کے ان کا اونچا مزار تعمیر کیا جائے۔ اس بات کے لئے بہت سے با اثر افراد جو وہاں پر موجود تھے کہنے لگے کہ وہ ابھی جا کر کمشنر ملتان سے سرکاری طور پر اجازت لے آتے ہیں لیکن ان کے صاحبزادے سید عطاء المنعم ابو معاویہ مدظلہ نے انکار کر دیا اور فرمایا کہ ان کے ابا جی نے اپنی زندگی میں کبھی بھی کوئی چیز حکومت سے نہیں مانگی اور اب ان کی رحلت کے بعد ہم انہیں سرکاری اراضی کا مرہون منت نہیں ہونے دینگے۔

سید عطاء اللہ شاہ بخاری رحمتہ اللہ علیہ تقریر کے بادشاہ تھے، اردو، پنجابی، فارسی، یہاں تک کہ عربی چاروں زبانوں کے الفاظ ان کے آگے ہاتھ جوڑ کر کھڑے رہتے تھے اور وہ انہیں جس طرح چاہتے استعمال میں لاتے۔ عشاء کی نماز کے بعد جب ان کی تقریر شروع ہوتی تو صبح کی اذان ہو جاتی مگر نہ الفاظ ختم ہوتے اور نہ ہی معانی۔ لوگ لاکھوں کی تعداد میں ہوتے اور مسحور ہو کر بیٹھے رہتے۔ شاہ جی جب چاہتے تمام اجتماع کو ہنسا دیتے اور جب چاہتے لوگوں کی آنکھوں میں آنسو کی جھڑیاں لگا دیتے۔ ان کی زبان ایک ایسی دو دھاری ذوالفقار تھی کہ کاٹ کرتی تو انگریز اور ہندو، دونوں کی گردنیں اڑا دیتی اور طنز کرتی تو اپنوں کے سینوں میں اتر جاتی لطیفے بیان کرنے پر آتے تو سننے والے پہلے ہنس پڑتے اور پھر جب انہیں ان لطیفوں کی حقیقت کا علم ہوتا تو رو پڑتے

اور جب کسی المیے کی داستان چھیڑتے تو اس کے آخر میں کوئی ایک ایسا فقرہ چسپاں کر دیتے کہ لوگوں کو امید کی کرنیں دکھائی دینے لگتیں۔ وہ کبھی مایوس نہیں ہوئے اور نہ ہی اپنی قوم کو کبھی مایوسی کی طرف دھکیلنے کی کوئی کوشش کی انہیں اپنے خدا پر بھروسہ تھا۔ انہیں اپنے ہادی ﷺ پر مکمل ایمان تھا۔ صحابہ کرامؓ کے پیروکار تھے اہل بیت ازواج رسول ﷺ کی تعظیم کا انہیں پاس تھا اور اولیاء کرام کی خدمات کے پوری طرح قائل تھے وہ بدعت کو بدعت کی حد تک رکھتے اور جیسا قیام پاکستان کے بعد علماء غلو پر اتر آئے جن میں سے بعض، بدعت کی مذمت میں حد سے بڑھ گئے اور بعض دوسرے بدعت کو بدعت کہنے سے ہی انکاری ہوگئے۔ شاہ جی نے ان دونوں کو ہمیشہ سمجھانے کی کوشش کی۔ شاہ جی فرماتے تھے کہ سب کو مل کر مرزائیت کے کفر کو ختم کرنے کی کوشش کرنی چاہیئے۔ ان کے دور میں تمام مکاتب فکر کے لوگ ان کے آگے زانوئے تلمذ طے کرتے۔ دیوبندی اور بریلوی جھگڑے کی جو شکل قیام پاکستان کے بعد نظر آنے لگی ہے وہ ان کے دور میں کہیں نہیں تھی۔ بلکہ میں نے اپنی آنکھوں سے بہت سارے شیعہ مسلک کے لوگوں کو دیکھا کہ وہ ان کی تقریریں سننے اور ان کی محفلوں میں آکر بیٹھتے۔

دہلی ہی کی بات ہے کہ ایک دفعہ مجھے پتہ چلا کہ شاہ جی وہاں آئے ہوئے ہیں۔ چنانچہ میں جمعہ کی چھٹی والے دن ان کے پاس پہنچ گیا۔ باتوں باتوں میں مجھے حکم فرمایا کہ کاغذ قلم سنبھالو اور جو کچھ میں کہوں لکھ کر اخبارات میں میری طرف سے بیان بھجوا دو۔ جب لکھوا چکے تو فرمایا کہ اب مجھے پڑھ کر سناؤ۔ وہاں ایک جگہ گاندھی کا لفظ تھا جس کے آگے میں نے از خود مہاتما لکھ دیا تھا۔ فرمانے لگے اسے کاٹ دو اور صرف گاندھی جی لکھو۔ یہ واقعہ اس لئے بھی اہم ہے کہ اس سے پتہ چلتا ہے کہ انکا کانگریس کی طرف جھکاؤ ضرور تھا لیکن اتنا نہیں جتنا بعض لوگ سمجھتے ہیں۔ تقسیم ہند کے فارمولے سے اختلاف انکا اپنا تھا نہ کہ کانگریس کی پیروی میں تھا۔

ویسے تو تمام جنوبی ایشیا کے برصغیر میں وادیٔ کشمیر سے لیکر راس کماری تک خلیج بنگال سے لیکر درہ خیبر تک ان کے مرید اور معتقد لاکھوں کی تعداد میں تھے۔ لیکن ان کے پیروکار جتنے جنوبی پنجاب میں تھے اتنے کہیں اور نہ تھے۔ میں بچہ تھا اور میرے والد صاحب مجھے ان کے جلسوں میں اکثر ساتھ لے جاتے تھے۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ جب انکی تقریر ختم ہوتی تو لوگوں کا ہجوم ان کی بیعت کے لئے تیار ہو جاتا تو ان کے حکم پر لوگ اپنی پگڑیاں اتار کے ایک دوسری سے گانٹھ لیتے اور اس طرح ایک طویل قطار بن جاتی شاہ جی کلمہ پڑھاتے اور لوگ ان پگڑیوں کو ہاتھ لگا کر کلمے کو دہراتے اور اس طرح خوش ہو کر مرید بن جاتے۔ دور دراز کے دیہاتوں میں حضرت شاہ جی جتنا سر کنڈے کے جھونپڑوں میں رہ کر خوش ہوتے اتنا پکے مکانوں میں نہ ہوتے بلکہ ہمارے ہاں جب بھی آتے تو سر کنڈے کے ایک چھپر میں ریت بچھا دی جاتی، پھر اس پر پانی کا چھڑکاؤ کر دیا جاتا جس سے ہاڑ کی لو بھی ٹھنڈی ہو جاتی جہاں آپ قیام فرماتے تھے اور بہت خوش ہوتے تھے۔

اب ایک آخری بات۔ گرمیوں کے دن تھے اگست کا مہینہ تھا اور سال ۱۹۶۱ء تھا۔ میں جب صبح کو جاگا تو مجھے قبلہ شاہ جی کی یاد آنے لگی۔ چنانچہ میں نے فیصلہ کیا کہ آج ملتان جا کر ان سے ضرور ملاقات کرونگا۔